بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات

نئے حالات ' نئے تقاضے

پروفیسر خورشید احمد

صدر کلنٹن کا پانچ روزہ دورۂ بھارت' جس میں جاتے جاتے پاکستان میں پانچ گھنٹے قیام کی زحمت بھی شامل ہے' برعظیم ہی نہیں' پورے ایشیا کی سیاست میں امریکہ کے مستقبل کے کردار کے خدوخال نمایاں کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ یہ دورہ اس علاقے کے باب میں امریکہ کی گذشتہ چالیس پچاس سال پر محیط پالیسی میں جوہری تبدیلیوں کا پیامبر ہے۔ امریکی قیادت نے "عبارت' اشارت اور ادا" غرض ہر ہر طریقے سے اپنے عزائم اور نئی ترجیحات کا اظہار کر دیا ہے۔ بھارت سے دوستی اور پاکستان سے کشیدگی کا پیغام بڑا صاف اور معنی خیز ہے۔ امریکہ کا یہ رویہ پاکستانی قوم اور اس کی قیادت کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے۔

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری دیانت' حقیقت پسندی اور ملک و ملت سے وفاداری کے ساتھ امریکہ سے اپنے تعلقات' ماضی' حال اور مستقبل کا ازسرنو جائزہ لیں۔ خوابوں اور تمناؤں کی دنیا سے نکلیں اور نئے حالات کی روشنی میں دن کی روشنی کی طرح روشن حقائق کے مطابق اپنے نظریاتی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی مقاصد و مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے ایک جان دار' واضح اور دیرپا حکمت عملی وضع کریں۔ اس دورے کا اگر کوئی حقیقی پیغام ہے تو وہ یہ ہے کہ "دوستوں میں سب سے قریبی دوست" (friendliest of the friend) اور "سب سے قریبی ساتھی" (most allied ally) کی دوستی اور قربت کی حقیقت کو سمجھیں' ہوا کے رخ کو پہچانیں' خوش فہمیوں کی بھول بھلیوں سے نکلیں اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ فیصلے کی اس گھڑی کا فائدہ اٹھائیں' کسی تاخیر کے بغیر اپنی پالیسی اور اہداف کا تعین کریں اور ان کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ

سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ ایک باوقار اور آزادی کی قدر کرنے والی قوم کی حیثیت سے آج ایک نئے عزم اور واضح پالیسی کی ضرورت ہے۔ لیت و لعل اور ماضی کی طرح وقت گزاری سم قاتل ہو گی۔ دوستی کے مجہول اور مبہم خوابوں کی دنیا سے نکلنا اور مردانہ وار اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے نئے عزم اور نئے پروگرام کی تشکیل امت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ امریکہ سے دوستی کے پچاس سالہ دور کا بے لاگ جائزہ' اور امریکہ کی نئی ترجیحات اور دوستی کے نئے دروبست کی روشنی میں اپنے مقام اور اپنے اہداف کا تعین ہی ہماری اولیں ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ پاکستان ملت اسلامیہ پاک و ہند کی جمہوری جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے نتیجے میں قائم ہوا ہے اور اللہ کی دی ہوئی اس امانت کی اصل امین ملت اسلامیہ پاکستان ہے۔ جو کام اس وقت درپیش ہے یہ کسی ایک فرد کے کرنے کا نہیں۔ نہ ہی اسے چند نام نہاد دانش وروں' سول سروٹنس' فوجی جرنیل یا این جی اوز کے کرتا دھرتا حضرات پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ قوم کو کرنا ہے اور کھلی بحث اور قومی اجماع (consensus) کی بنیاد پر کرنا ہے اور ہر مصلحت سے بالا ہو کر کرنا ہے۔ چونکہ اس فیصلے پر ہماری آزادی' سلامتی اور باعزت قومی زندگی کا انحصار ہے' اس لیے کسی کو یہ حق اور اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی قسمت سے کھیلے۔ موجودہ فوجی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قوم کو اعتماد میں لے اور اس کے تاریخی عزائم' ملی جذبات اور قومی سلامتی کے تصورات کے مطابق خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کرے جو حقیقی قومی یک جہتی اور اتفاق رائے پر مبنی ہو۔

اس وقت مرکزی مسئلہ امریکہ سے تعلقات کے منہج کا ہے لیکن ناگزیر ہے کہ اس میں بھارت اور دوسری عالمی قوتوں سے تعلقات بھی زیر بحث آئیں۔ اس وقت عالمی سیاست کا جو نقشہ زیر تشکیل ہے اس کے پس منظر میں یہ سارا کام ہونا ہے' اس لیے خارجہ پالیسی کے سارے ہی پہلوؤں پر اس وقت از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ وقتی یا نمایشی اقدامات کا نہیں بلکہ طویل عرصے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر پالیسی سازی کے اہتمام کا ہے۔ یہ کام بند کمروں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر کھلی بحث ہو اور حکومت بھی پوری قوم اور اس کے معتمد نمایندوں کو مشورے میں شریک کرے تاکہ حقیقی قومی پالیسی وجود میں آسکے۔ بیرونی مبصر بھی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ اس وقت پاکستانی قوم کے افکار' اس کی خواہشات اور جذبات اور مغربی سیاست سے وابستہ اور انگلش میڈیم کلاس کے احساسات جدا جدا ہیں۔ ہفت روزہ اکانومسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں کلنٹن کے اس دورے کے پس منظر میں پاکستانی قوم کے مخمصے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے صرف نظر بہت بڑی افتاد پر منتج ہو سکتا ہے:

یہ بات واضح ہونے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے کہ جناب کلنٹن نے پاکستان کو ٹھنڈا کیا ہے یا مشتعل

کیا ہے۔ پاکستان کے انگریزی زبان کے اخبارات نے جو پاکستان کے آیندہ رخ کے بارے میں کلنٹن کے ہم خیال ہیں، اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا تقریباً خیر مقدم کیا۔ اردو پریس نے جو عوامی رائے سے زیادہ قریب ہے، اس پر بھارت کو پرچانے کا الزام لگایا ہے (اکانومسٹ، یکم اپریل ۲۰۰۰ء، ص ۶۱)۔

بات صرف اردو پریس کی نہیں۔ انگریزی پریس میں بھی عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنے والی تحریریں آتی ہیں، چاہے تعداد میں کم ہوں۔ اصل مسئلہ مخصوص طبقات کی خواہشات یا مفادات کا نہیں، بحیثیت مجموعی قوم کے جذبات، احساسات، عزائم اور امنگوں کا ہے اور عوام کی مرضی سے بے پروا ہو کر اگر کوئی راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ تصادم اور تباہی کا راستہ ہے، جس سے بچنا بہتر ہے۔

اس لیے ہم سب سے پہلے ان دو باتوں کا برملا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ:

۱- اولیں ضرورت پاک امریکی تعلقات کے بے لاگ جائزے اور قومی عزائم، سلامتی اور آزادی کے تقاضوں کے حوالے سے واضح اور دیرپا پالیسی کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ شترمرغ کی طرح زمین میں سر چھپانے، کبوتر کی طرح خطرے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے اور گیدڑ کی طرح خائف ہو کر دم ہلانے میں آزادی اور عزت داروں کی موت ہے۔ ضرورت شیر کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کی ہے لیکن یہ کام پوری حقیقت پسندی، بالغ نظری اور دیرپا اثرات کو نگاہ میں رکھ کر کرنے کا ہے۔

۲- پالیسی کے جائزے اور تشکیل نو کا کام نہ صرف یہ کہ قومی عزائم اور مفادات کی روشنی میں انجام پانا چاہیے بلکہ اس موقف کو اختیار کرنے اور اس پر جم جانے کی ضرورت ہے جس کی تشکیل قومی اتفاق رائے سے ہو۔ قوم کو اعتماد میں لیا جائے اور اس کی موثر شرکت سے پالیسی سازی انجام دی جائے۔ یہ کام محض وزارت خارجہ یا چیف ایگزیکٹو کے سیکرٹریٹ کا نہیں، اس میں قوم کے تمام حقیقی نمایندوں کی شرکت اور ان کا اطمینان ضروری ہے۔ وہی فیصلہ قائم رہ سکتا ہے جو قومی سوچ پر مبنی ہو اور جسے اجتماعی ضمیر کی پشت پناہی حاصل ہو اور یہی اسلام اور جمہوریت کی روح ہے۔

ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ صدر کلنٹن کا دورہ کامیاب رہا یا ناکام؟ گو دورے کے بعد سے اس موضوع پر بھارت اور پاکستان ہی نہیں، یورپ اور خود امریکہ میں بھی بڑی لے دے ہو رہی ہے۔

برعظیم کا یہ دورہ صدر کلنٹن کا اپنے دورہ صدارت کا باسٹھواں (۶۲) دورہ تھا اور جس تام جھام اور شاہی کروفر سے اس کا اہتمام کیا گیا اس میں یہ منفرد تھا۔ صدر کے ایرفورس ون کے ساتھ ۷۶ جہازوں کا ایک قافلہ پرشکوہ تھا جو امریکہ کی ایرفورس کی کارگو ڈویژن کا ایک تہائی ہے۔ محض جہازوں نے چار دن تک

روزانہ ۵۰ پروازوں کے ذریعے وہ سارا سازوسامان اور عملہ کے افراد بھارت پہنچائے جو جمہوری صدر کی حفاظت پر مامور تھے۔ خفیہ اداروں کے ۱۰۰، ۲۰۰ جوان ۳۰ بلٹ پروف گاڑیاں، دو فوجی ٹرک، ایک درجن ہیلی کاپٹر حتیٰ کہ بستر، پانی اور حفاظتی کتوں کا لشکر ہر لمحہ خدمت پر کمربستہ رہے۔ جمہوریت اور مساوات کے اس پیامبر کے صرف ایک سفر پر ۷۵ ملین ڈالر خرچ آئے۔ گویا جمہوری صدر نے بادشاہی دور کی یادگار تاج محل کو دیکھنے والے سفر پر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالا جو تاج محل کی تعمیر پر خرچ ہوا ہو گا۔ اس سب کے باوجود امریکی تجزیہ نگار صاف کہہ رہے ہیں کہ جن مقاصد کے لیے یہ دورہ کیا گیا تھا اور جن کا اظہار خود صدر کلنٹن نے اپنے اس مضمون میں کیا تھا جو ۲۰ مارچ ۲۰۰۰ء کے انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون میں شائع ہوا تھا، یعنی دنیا کے خطرناک ترین علاقے کو جنگ کے خطرات سے پاک کرنا، نیوکلیر عدم پھیلاؤ کی امریکی پالیسی پر بھارت اور پاکستان کی آمادگی، اور کشمیر کے مسئلہ کے حل کی کوئی راہ نکالنا، ان اہداف کی حد تک کلنٹن خالی ہاتھ واپس گئے ہیں اور ناقدین کے جواب میں سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں یوں برس پڑے کہ "میرے کامیاب نہ ہونے کی وجہ سینیٹ میں ری پبلکن پارٹی کا سیاسی کھیل ہے جس نے سی ٹی بی ٹی کی توثیق نہ ہونے دی"۔ اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، واشنگٹن ٹائمز سبھی نے یک زبان ہو کر اس دورے کو سب سے مسرفانہ اور امریکہ کے اس علاقہ میں اہداف کے اعتبار سے ناکام قرار دیا ہے۔ ہفت روزہ ٹائم نے اس کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ:

> بل کلنٹن جنوبی ایشیا کے دورے سے واپس آئے ہیں تو دہلی میں خوشی و مسرت ہے، اسلام آباد میں ناامیدی، اور کشمیر میں مایوسی کی کیفیت ہے۔ امریکی صدر اپنے ساتھ تحائف سے بھرا ہوا سوٹ کیس لائے اور جسے وہ آج کی دنیا کا خطرناک ترین علاقہ کہتے ہیں، اس کی سفارتی بارودی سرنگوں سے بچ آنے پر سکون محسوس کر رہے ہیں۔ دورے کے نتیجے میں کلنٹن اس سے زیادہ خطرناک علاقہ چھوڑ کر آئے ہیں جتنے خطرناک علاقے میں وہ گئے تھے (۳۰ اپریل ۲۰۰۰ء)۔

اور مستقبل کے بارے میں ٹائم کی پیش گوئی یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں کلنٹن کے مشورے پر عمل نہیں کرتیں تو:

> آنے والے مہینوں میں دہلی کی خوشیاں غم میں اور اسلام آباد کی ناامیدیاں مایوسی میں تبدیل ہو جائیں گی اور کشمیریوں کی مایوسی علیٰ حالہ رہے گی۔

یہ کام امریکہ کے ارباب حل و عقد کا ہے کہ وہ سوچیں کہ امریکہ نے اس دورے سے کیا پایا اور کیا کھویا۔ واشنگٹن ٹائمز نے تو کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے اس دورے کو مہنگی ناکامی (costly failure) قرار دیا ہے لیکن پاکستان کے لیے اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اگر اب بھی ہماری قیادت اور امریکہ پر

ایمان رکھنے والے بااثر طبقات کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو کم از کم پاکستانی قوم کی حد تک اپنی ساری کج مہری، بدذوقی، طوطا چشمی اور ہتک آمیزی کے باوجود یہ تلخ تجربہ ایک محفوظ، قابل اعتماد اور کامیاب تر مستقبل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بات گلے شکوے سے آگے جا چکی ہے اور ہمارے لیے بحیثیت قوم ضروری ہو گیا ہے کہ توقعات رکھنے کے چکر سے نکل کر حقائق کا مقابلہ کریں اور اپنی راہ خود نکالنے کے باعزت رویے پر سختی سے قائم ہونے کا عزم کریں۔

امریکہ سے تعلقات کے موجودہ دور کا آغاز ۱۹۵۰ء میں وزیراعظم لیاقت علی خاں کے دورہ امریکہ سے ہوا جو مارچ ۲۰۰۰ء میں صدر کلنٹن کے دورہ بھارت پر ختم ہو گیا۔ امریکہ نے پہلے چار سال (۵۴-۱۹۵۰ء) پوری کوشش کی کہ پاکستان، بھارت اور افغانستان یکساں پالیسی اختیار کریں اور پاکستان جنوبی ایشیا کی ایک ریاست کی حیثیت سے آگے بڑھے اور یہ تینوں مل کر دوسری جنگ کے بعد کی سیاست میں امریکہ کا ساتھ دیں۔ امریکہ کی بے پناہ خواہش اور کوشش تھی کہ بھارت اس کا ساتھ دے اور اشتراکی دنیا کے گرد جو حصار امریکہ بنانا چاہتا ہے اس میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن پنڈت نہرو نے کسی صورت میں بھی اس نظام کا حصہ بننے کے لیے آمادگی کا اظہار نہ کیا بلکہ انڈونیشیا اور چین کے ساتھ مل کر غیر جانب دار تحریک (non-aligned movement) کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جو امریکی پالیسی کے خلاف تھی۔ پاکستان، خود اپنی حکمت عملی کے تحت، جنوبی ایشیا سے زیادہ اپنے کو وسطی ایشیا اور شرق اوسط کا حصہ سمجھتا تھا اور انھی ممالک کے درمیان اپنے مستقبل کا کردار دیکھ رہا تھا۔ ان حالات میں ۱۹۵۴ء میں پاکستان امریکہ کے دفاعی معاہدوں سیٹو (Seato) اور سینٹو (Cento)، بغداد پیکٹ کا رکن اور سرد جنگ میں امریکہ کا سب سے قریبی حلیف بن گیا۔ امریکی جمہوریت کو جنرل ایوب کی فوجی آمریت میں کوئی خرابی نظر نہ آئی اور دونوں خوب شیروشکر ہوئے۔ جنرل ایوب نے امریکی کانگریس سے خطاب کیا اور ابدی دوستی کے عہدوپیمان ہوئے۔

لیکن ۱۹۶۲ء کی پہلی آزمایش میں امریکہ پھر بھارت کی طرف لوٹ گیا، چین سے نام نہاد مقابلے کے لیے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو کیل کانٹے سے لیس کیا، اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنالوجی اور نیوکلیر ٹیکنالوجی سے نوازا اور پاکستان کو تقریباً زبردستی کشمیر میں اقدام کرنے سے روک دیا جس سے ایک تاریخی موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے تین سالہ امریکی فوجی اور معاشی امداد سے حاصل ہونے والی قوت کے زعم میں پاکستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے اپنے حلیف کا ساتھ دینے کی بجائے دونوں سے برابری (even handedness) کے نام پر پاکستان کی فوجی امداد روک دی حالانکہ بھارت کی فوجی سپلائی کا بڑا انحصار روس پر تھا، جب کہ پاکستان کا تقریباً مکمل انحصار امریکی اسلحہ کے نظام پر تھا۔ جنرل یحییٰ سے بھی

دوستی کی پینگیں بڑھتی رہیں اور کسنجر اور نکسن کے لیے چین تک رسائی کی خدمات انجام دینے والے پاکستان سے پھر ۱۹۷۱ء کے نازک لمحے میں جب بھارت نے دہشت گردی اور مکتی باہنی کی کھلی تائید کی اور پھر نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی، اسی طرح بے وفائی کی گئی جس طرح ۱۹۶۵ء میں کی گئی تھی۔ اب جو سرکاری دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان میں امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ کے وہ نوٹ موجود ہیں جو دونوں مواقع پر صدر امریکہ کو لکھے گئے اور دونوں میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ گو پاکستان سے ہماری دوستی اور معاہدات ہیں مگر ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیں۔

امریکہ کی مخالفت کا سب سے نمایاں اظہار ہماری نیوکلیر پالیسی کے سلسلے میں ہوا جس کے بارے میں امریکی خارجہ سیکرٹری ہنری کسنجر نے ان سارے احسانات کے باوجود جو چین سے روابط کے باب میں پاکستان نے خطرات مول لے کر کیا تھا اور جن کے باعث اسے "وفادار دوست" سمجھا جاتا تھا ایک "عبرت ناک مثال" (horrible example) بنانے کی دھمکی دی اور کارٹر نے قطع تعلق کر کے معاشی پابندیوں کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیا۔ یہ تو افغانستان پر روس کا حملہ اور اشتراکیت کی اس یورش کے خلاف افغان مجاہدین اور پاکستان کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان کی دوستی کی ضرورت پڑی لیکن جیسے ہی افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے، افغانستان اور پاکستان دونوں سے آنکھیں پھیر لی گئیں۔

یہ ضرور ہے کہ جزوی طور پر پاکستان کو فوج کی تنظیم نو، عسکری قوت کی ترتیب و تزئین اور معاشی میدان میں امریکہ سے اس دور میں کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ایسے فوائد ہم حاصل نہ کر سکے جن کا امکان اور موقع تھا مگر قیادت کی نااہلی، بدعنوانی اور خوشامدانہ ذہنیت کی وجہ سے انھیں حاصل نہ کیا جا سکا۔ لیکن اگر پورے دور کا میزانیہ مکمل معروضی انداز میں تیار کیا جائے تو چند نتائج سامنے آتے ہیں۔

امریکہ نے اس پورے دور میں ہمارے ساتھ، اور ہمارے ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا اور عالم اسلام کے جن جن ممالک کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا وہ خالص امریکی مفاد کی بنیاد پر تھا۔ گو اس پورے عرصے میں آزاد دنیا، جمہوری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا تذکرہ رہا اور نظریاتی اور اخلاقی اصولوں اور عالمی اقدار کی بات بھی بڑے بلند بانگ انداز میں کی گئی لیکن فی الحقیقت امریکی پالیسی کا ایک ہی مرکزی اصول ہے اور وہ امریکہ کا بحیثیت ایک عالمی قوت مفاد ہے۔ اس کی دوستی نہایت ناقابل اعتماد اور ناقابل بھروسہ ہے۔ اس کے لیے چشم زدن میں آنکھیں پھیر لینا ایک معمول ہے۔ یہ محض ہمارا تجربہ ہی نہیں، امریکہ کے اعلیٰ ترین پالیسی سازوں نے پوری میکیاولانہ چابک دستی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہی ان کی حقیقی پالیسی

ہے اور اگر اسے دوسرے نہیں سمجھتے تو یہ ان کی کور چشمی ہے، امریکہ کا دوغلا پن نہیں۔

امریکہ سے پاکستان کے جتنے بھی معاہدے ہوئے ہیں ان میں کبھی بھی امریکہ نے مصیبت کے وقت مدد کی قانونی اور دستوری ذمہ داری قبول نہیں کی۔ کئی امریکی صدور اور خارجہ امور اور دفاع کے سیکرٹریوں نے مدد کی زبانی یقین ہانی کرائی مگر اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔ جنرل ایوب نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو امریکی کانگرس کے مشترکہ اجلاس میں کہا تھا:

> وہ لوگ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے صرف پاکستان کے لوگ ہوں گے بشرطیکہ آپ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے جواب میں صدر کینیڈی نے کہا تھا:

> پاکستان فوری اور دیرپا ضرورت کے وقت کا دوست ہے۔ امریکی اپنی نجی اور عوامی زندگی میں دوستوں کی دوستی اور اس کی پایداری کی قدر کرتے ہیں۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں ہی اس کا پول کھل گیا اور پھر امریکی خارجہ سیکرٹری ڈین رسک نے یہ اصول بیان کر کے، پاکستان ہی نہیں، پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا:

> وعدے ہمیں کسی خاص اقدام کا پابند نہیں بناتے۔ زیادہ تر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جارحیت کی صورت میں ہم مشترک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دستوری طریق کار کے مطابق اقدام کریں گے۔ ہم دستوری تقاضوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس کا انحصار صورت حال کے حقائق پر ہو گا۔ بعض صورتیں دوسری کے مقابلے میں ہمارے کم اقدام کا تقاضا کرتی ہیں۔

۱۹۶۶ء میں سینیٹر سیمنگٹن نے وزارت خارجہ کو مجبور کیا کہ commitment کی وضاحت کریں تو محکمہ خارجہ کے ایک سینیر افسر نے اس میکاویلین اصول کو بیان ہی کر دیا کہ:

> صدر آج ایک بیان دے سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اگلے دن اس سے دست بردار ہو جائیں۔ امریکہ پر صدر کے بیانات کی وجہ سے کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

پاک امریکی تعلقات کی پچاس سالہ داستان انھی کہہ مکرنیوں کی داستان ہے اور اس "اصول" کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے امریکی جمہوریت کے بانی جارج واشنگٹن نے بیان کیا تھا:

> ایک چھوٹی اور کمزور ریاست کا، ایک بڑی اور طاقت ور ریاست سے تعلق اول الذکر کے لیے آخر الذکر کا لاحقہ ہونا لازمی کر دیتا ہے۔ کسی قوم کا غیر متعلق لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ وہ اس حوالے سے اگر کچھ حاصل کرے تو اسے اپنی آزادی کے ایک حصے سے اس کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔

اقبال نے طاقت کی سیاست کے اس کھیل سے بروقت متنبہ کیا تھا، اگر ہم نے آنکھیں بند رکھیں تو

غلطی ہماری ہے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

امریکہ کی دوستی کا ایک اور لازمی نتیجہ سیاسی، معاشی اور خود عسکری میدان میں محتاجی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہم نے عالمی سیاست میں اپنی دوستیوں اور دشمنیوں کو بڑی حد تک امریکہ کے عالمی عزائم اور نظام کے تابع کر لیا اور ایک حقیقی طور پر آزاد اور ملت اسلامیہ کے مفاد کی محافظ خارجہ پالیسی وضع نہ کر سکے۔ معاشی میدان میں ہم بیرونی امداد اور قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے اور آج عالم یہ ہے کہ قرضوں کی غلامی نے ہماری آزادی کو پابند سلاسل کر دیا ہے اور ہماری پوری معیشت ملک کی حقیقی ضروریات اور قوم کی ترجیحات کے بجائے بیرونی ساہوکاروں کے اشارۂ چشم و ابرو کی تعمیل میں لگی ہوئی ہے۔ فوجی سروسامان اور جنگی آلات اور صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی ہمارا بڑا انحصار امریکہ پر ہو گیا ہے اور چونکہ وہ اپنے وعدوں کا پابند نہیں (حتیٰ کہ F-16 جن کی قیمت بھی ہم پیشگی ادا کر چکے ہیں، ان تک کو نہ ہم حاصل کر سکے اور نہ ان کی قیمت واپس لے سکے ہیں) اور جب چاہے اپنے مصالح کے تحت رسد کی راہیں مسدود کر سکتا ہے اس لیے ہماری دفاعی صلاحیت میں مسلسل کمی آ رہی ہے۔

یہ دوستی ہمیں ہر میدان میں بحیثیت مجموعی بہت مہنگی پڑی۔ سارا الزام امریکہ کی مفاد پرستی اور دوغلے پن کو دینا انصاف کے خلاف ہو گا۔ اس نے اپنے قومی مفاد میں جو مناسب سمجھا، کیا لیکن اصل ذمہ داری ہماری اپنی قیادتوں کی ہے جن میں فوجی اور سول اور مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں برابر کی شریک ہیں۔ اس پہلو سے ہمیں صدر کلنٹن کا ایک حد تک ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بڑی رعونت سے ہتک آمیز انداز میں پاکستانی قوم کی غیرت کو جگایا اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا ہے اور ہمیں فیصلہ کن موڑ کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ سارا کام پوری منصوبہ سازی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے سامنے اس ڈرامے کے تمام سین رکھے جائیں تاکہ محض دوستی اور بے وفائی کے تذکرے میں بات گم نہ ہو جائے۔

عالمی قوت کی حیثیت سے سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد امریکہ نے جس نئے عالمی نظام کا خاکہ تیار کیا ہے اس کے چار اہم ستون ہیں۔ ان چاروں کا اصل مقصد یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں جب تک ممکن ہو امریکہ کو واحد سوپر پاور کی حیثیت حاصل رہے اور کوئی متبادل قوت وجود میں نہ آنے پائے۔ اس

سلسلے میں جن مفکرین نے اس حکمت عملی کو فکری بنیادیں فراہم کی ہیں ان میں فرانسس فاکویاما کا اختتام تاریخ (The End of History) کا فلسفہ، سیمبویل ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilisations) کا نظریہ اور برزنسکی کی شطرنج کی عظیم بساط (The Grand Chessboard) خصوصیت کی حامل ہیں۔ اس فریم ورک میں دسیوں تحقیقی مقالات اور تھنک ٹینک کی رپورٹیں اور سیاست دانوں کی عملی کارروائیاں ہیں جن کے مطالعے اور تجزیے سے مستقبل کے نقشے کے دروبست صاف نظر آتے ہیں۔ یہ چار نکاتی فارمولا کچھ اس طرح ہے:

۱- عالم گیریت (Globalisation) جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں آزاد تجارت، سرمایہ کی آزاد حرکت اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ذریعے عالمی معیشت پر مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ کے تسلط کو دائمی شکل دی جائے۔ اس طرح دولت کی اس غیر مساویانہ تقسیم کو مستحکم کر لیا جائے جو سامراجی دور کی پیداوار ہے اور جس کے نتیجے میں مغربی اقوام (یورپ اور امریکہ) جو ۱۸۰۰ء میں عالمی پیداوار کا صرف ۲۷ فی صد پیدا کر رہی تھیں، ۱۹۱۸ء میں ان کا یہ حصہ بڑھ کر ۸۷ فی صد ہو گیا جبکہ ان کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا صرف ۱۸ فی صد ہے۔ اس نظام کو مستقل صورت اسی وقت دی جا سکتی ہے جب دنیا کے دوسرے ممالک اپنی معیشت کو خود انحصاری کی بنیاد پر ترقی نہ دے سکیں بلکہ اس عالمی نظام کا حصہ بن کر خام مال فراہم کرنے اور مصنوعات درآمد کرنے کا کام انجام دیں۔ اس طرح ترقی یافتہ ممالک کو نہ صرف یہ مسلسل بالادستی حاصل رہے بلکہ باقی دنیا ان کی محتاج رہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آزاد تجارت اور آزادی نقل و حرکت کے یہ علم بردار، انسانوں کی آزاد نقل و حرکت کے قائل نہیں ہیں اور انسانی آبادی کی حرکت (migration) پر کڑی پابندیاں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مغربی اقوام کی بالادستی متاثر نہ ہو سکے۔ اگر آبادی کی کچھ حرکت ہو تو وہ بھی اس شکل میں کہ ترقی پذیر ممالک کے پڑھے لکھے اور دولت و ثروت کے مالک افراد مغربی ممالک میں داخل ہو سکیں اور مادی وسائل کے بہاؤ کے ساتھ اعلیٰ صلاحیت اور وسائل کا بہاؤ ہوتا رہے اور یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی تقویت کا ذریعہ بنتے رہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی معدنیات، توانائی کے سرچشموں خصوصیت سے تیل اور گیس پر مستقل قبضہ اور ان تک رسائی کے راستوں کی حفاظت کی جائے۔

۲- اس نظام کا دوسرا ستون سیاسی ہے یعنی انفرادی آزادی، جمہوریت، حقوق انسانی کا تحفظ اور مذہبی رواداری کی ترویج اور اس کے پردے میں ان ممالک میں ایسے نظاموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن کو سیاسی جوڑ توڑ، مالی وسائل، معاشی مراعات اور ذرائع معلومات کے توسط سے فکری کنٹرول اور تہذیبی غلبے کے ذریعے بہ آسانی متاثر کیا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کی جمہوریت کی تعبیر بڑی نرالی ہے۔ جمہوریت

کے معنی تمام انسانوں کی مساوات نہیں اور نہ لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے عقائد' اقدار اور ترجیحات کی روشنی میں اپنا نظام زندگی طے کریں۔ جمہوریت کی تعبیر یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کو اس طرح پروان چڑھایا جائے کہ یہ ممالک مغرب کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر ایسی قیادتیں مسلط رہیں جو مغربی تہذیب کی ولدادہ اور مغربی مفادات کی محافظ ہوں۔ نیٹو کو اب وسعت دے کر یورپ کی ان اقوام کو بھی اس کے چنگل میں پھانسا جا رہا ہے جو اپنا الگ تہذیبی وجود رکھتی ہیں اور کل کسی متبادل نظام کے لیے زمین فراہم کر سکتی ہیں۔ ترکی میں جمہوری تماشے کے باوجود پورا ملک سیکولر فوجی قیادت کی گرفت میں رہے' الجزائر میں عوام اپنی آزاد مرضی سے اگر اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں تو ان کی پوری قیادت کو پابند طوق و سلاسل کیا جائے' ملک میں سول وار کی کیفیت پیدا کر دی جائے اور یہ سب جمہوریت کے نام پر ہو۔ جمہوریت تہذیبوں اور نظام زندگی کے تعدد کا ذریعہ نہ بنے بلکہ جمہوریت کے عنوان سے مغربی سیاسی اور معاشی ادارے پوری دنیا پر مسلط کیے جائیں اور ان کے ذریعے وہاں کی آبادیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ جہاں کہیں حالات مغربی اقوام کی مرضی کے مطابق نہ ہوں وہاں انسانی بنیادوں پر مداخلت کے نام پر فوج کشی تک کا حق اپنے پاس محفوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی عالمی ادارے کی اجازت بھی ضروری نہیں بلکہ یہ سب امریکہ اور اس کے ہم نوا ممالک کے دائرہ اختیار میں رکھا جائے۔

جمہوریت کے یہ علم بردار کسی بالاتر قانون اور کسی غیر جانب دار اتھارٹی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اقوام متحدہ کو ایک غیر موثر ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے پاس کوئی اختیار نہیں اور سیکورٹی کونسل جسے کارروائی کا اختیار ہے اس میں پانچ طاقتوں کو ویٹو کا حق حاصل ہے اور اگر اس حق کی توسیع کی بات ہو رہی ہے تو وہ بھی کسی جمہوری اصول پر نہیں بلکہ اپنے ہی طائفے کے کچھ دوسرے ارکان کو مسلط کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جو اہم عالمی مالیاتی ادارے ہیں ان میں بھی انھی مال دار ممالک کو اکثریت حاصل ہے اور ان کے اشارہ ابرو کے بغیر وہ ذرا بھی جنبش نہیں کر سکتے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کو اگر جمہوریت سے حقیقی دل چسپی ہوتی تو سب سے پہلے ان اداروں کو جمہوری رنگ میں رنگنے کی فکر کرتے لیکن اس کا دور دور پتا نہیں۔ عالمی میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذرائع پر مغربی اقوام کا کنٹرول بھی اس لبرل آرڈر کا حصہ ہے۔ اس طرح عالم گیریت اور جمہوری آزاد روی (democratic liberalisation) اس نئے نظام کے ایک دوسرے کو مضبوط کرنے والے دو جڑواں ستون (twin pillars) ہیں۔

۳۔ اس نظام کا تیسرا ستون ٹکنالوجی ہے' خصوصیت سے نیوکلیر اور ہائی ٹیک (Hi-tech) کمپیوٹر ٹکنالوجی پر مغربی اقوام کی اجارہ داری ہے۔ نئے دفاعی نظام کا بنیادی ستون امریکہ کی مستقل اور ناقابل چیلنج

عسکری قوت کا استحکام اور اسے جہاں سے بھی کوئی خطرہ ہو (خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو) اسے ختم کرنے کا حق ہے۔ سدجارحیت (deterrance) کے معنی اس نظام میں یہ ہیں کہ امریکہ اور اس کے حواریوں کی قوت اور بالادستی کو چیلنج کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایٹمی عدم پھیلاؤ کا مقصد دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کرنا نہیں' مغرب کی نیوکلیر بالادستی کو دائمی بنانا اور ہر چیلنج کا راستہ روکنا ہے۔ کیمیاوی اور گیس کے ہتھیاروں پر پابندی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اسی طرح میزائل کے نظام کو لگام دینے کا پروگرام بھی اس عسکری بالادستی کا تحفظ ہے۔

دہشت گردی (terrorism) کے باب میں جو محاذ کھولا گیا ہے اس کا مقصد بھی دنیا میں ابھرنے والی ہر متبادل قوت کو ایک قسم کے سوچے سمجھے تشدد کا نشانہ بنانا ہے جو خود انسانیت کے خلاف ایک سنگین جرم ہے۔ کوئی صحیح العقل انسان دہشت گردی اور تشدد کی حمایت نہیں کر سکتا لیکن مظلوم اگر ظالم کے خلاف ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جائے یا محکوم اقوام اپنی آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد کی راہیں مسدود ہونے کی صورت میں ظالم حکمرانوں کے مراکز قوت پر ضرب لگائیں تو اسے دہشت گردی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اگر یہ دہشت گردی ہے تو دنیا کے موجودہ سیاسی نقشے کا ۸۰ فی صد ایسی ہی جدوجہد کے نتیجے میں صورت پذیر ہوا ہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس کی سب سے قریبی مثال مشرقی تیمور ہے' جہاں ۲۰ سالہ عسکری جدوجہد کے بعد اقوام متحدہ کے زیرانتظام استصواب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مشرقی تیمور اپنے تیل کے ممکنہ ذخائر کی وجہ سے مغربی اقوام کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور ایک مسلمان ملک کو کمزور کر کے ایک عیسائی ریاست کا قیام اس کا نتیجہ ہے۔ لیکن بات اصول کی ہے اور جس حق کے تحت اقوام متحدہ کے ۱۳۰ ممالک آزاد ہوئے ہیں اسے محض اس لیے دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کشمیر' کوسووا' چیچنیا اور منڈاناؤ میں اس کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچے گا۔

۴۔ اس نظام کا چوتھا ستون نئی سیاسی حصار بندی ہے جسے بہت ہی ہوشیاری لیکن عیاری کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔ اس میں ناٹو کی توسیع' مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے قیام کے بعد اس کے معاشی غلبے کے لیے صلح کاری' وسط ایشیا میں ایک بار پھر روس اور مغرب سے منسلک ریاستوں کے مسلمان ریاستوں پر اثرانداز ہونے کے نظام کے دروبست' بھارت کو ایک ایشیائی قوت کے طور پر آگے لانے کی کوشش--- اس حصار بندی کا اصل ہدف اب چین اور عالم اسلام اور خصوصیت سے عالم اسلام کے وہ ممالک ہیں جو کچھ بھی آزاد روی اختیار کر سکتے ہیں اور جن میں اسلامی تحریکات ایک غالب قوت بن سکتی ہیں۔ اولیں ہدف چین کے ساتھ ایران' افغانستان اور پاکستان ہیں۔ ترکی کو یورپی یونین میں ضم کرنے اور ترک کرد کش مکش کے ذریعے مستقل طور پر جنگ و جدال میں مصروف رکھنے کا پروگرام ہے۔ وسط ایشیا

کی اسلامی تحریکوں کو دہشت گردی کے نام پر قابو کرنے کا منصوبہ ہے۔ ایران اور افغانستان کو دبانے یا بدلنے کا ہدف ہے۔ پاکستان کو کمزور کرنے' چین کے ساتھ غلط فہمیاں پیدا کرنے اور اس کو ایران اور افغانستان کے قریب نہ ہونے دینے کی کوششیں ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان پر معاشی دباؤ کے ساتھ ساتھ اسے بھارت کی طرف سے عسکری خطرات سے بھی دوچار کرنا ہے۔ یہ اپنی روح اور مقاصد کے اعتبارات سے اسی طرح کا ایک حصار بندی کا نظام ہے جیسا سرد جنگ کے زمانے میں روس' چین اور مشرقی یورپ کے خلاف قائم کیا گیا تھا' گو نئے حالات کے پیش نظر اس کا اسلوب اور عنوانات مختلف ہیں۔ اس انتظام میں علاقے' ملک اور سیاسی ساتھیوں سب کے مقام اور تعلقات کی نوعیت میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں: "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!"

اس پس منظر میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان امریکہ کا فطری حلیف نہیں رہا اور بھارت اس کا "فطری حلیف" اور "اسٹرٹیجک پارٹنر" بن گیا ہے' خواہ بھارت میں حکومت اس پارٹی کے ہاتھوں میں ہو جو ہندو تشدد پرستی (Hindu Chanvinism) کی پرچارک' سیکولرازم کے مقابلے میں ہندووتا کی مبلغ' مسلمانوں' عیسائیوں اور تمام اقلیتی گروہوں کے خون کی دشمن اور ان کے تہذیبی قتل پر کاربند ہو۔ نیا نقشہ' نئی دوستیوں اور پرانے تعلقات پر نظرثانی کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین نے کہا ہے کہ عملی سیاست میں کوئی دوستی مستقل نہیں ہوتی' مستقل چیز تو صرف مفاد کا حصول ہے اور مفادات کی شکل اور نوعیت صحرا کی ریت کی حرکت کی طرح بدلتی رہتے۔ اسی روشنی میں دوستوں اور مخالفین کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ ہمیں امریکہ کی نئی ترجیحات اور نئی راہوں کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اپنے مقاصد اور مفادات کے تحفظ کے لیے کاربندی کی فکر کرنی چاہیے۔ محض پرانی دوستیوں کا گلہ' یا ان کے بحال ہو جانے کے خواب دیکھنا حقیقت پسندی کے خلاف ہے ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو' غالب
ترے بے مہر کہنے سے' وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

بھارت کے لیے امریکہ کی مختلف حکومتوں میں' خصوصیت سے ڈیموکریٹ صدور اور پارٹی لیڈرشپ میں' ایک نرم گوشہ تو شروع ہی سے رہا ہے اور اس کے جغرافیائی محل وقوع' رقبے' آبادی' معاشی وسائل' مارکیٹ کی وسعت اور سیاسی اثرورسوخ کی وجہ سے اسے غیرفطری نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جس طرح بھارت کی قیادت نے' نہرو دور ہی سے' خود کو سوشلسٹ نظام کا علم بردار' روس سے خصوصی تعلق اور غیرجانب تحریک کے رکن رکین کی حیثیت سے پیش کیا' اس نے سرد جنگ کے دور میں اسے امریکہ سے دور رکھا۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد حالات بدلے۔ بھارت نے بھی سوشلسٹ نظام کو (جیسا کچھ بھی وہ تھا) ختم کر کے منڈی کی معیشت کا راستہ اختیار کیا اور تجارت میں بھی نسبتاً آزاد روی کی پالیسی اختیار کی۔ افغانستان کے بارے میں روس کا ساتھ دینے کے باوجود اس نے آہستہ آہستہ امریکہ سے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ ۱۹۹۵ء تک ان روابط نے ایک واضح شکل اختیار کرلی جس میں معاشی تعاون' تجارت میں روز افزوں اضافہ' امریکی سرمایہ کاری میں اضافہ' سیاسی معاملات میں مفاہمت' عراق کے خلاف جنگ کے موقع پر امریکی ہوائی جہازوں کو تیل کی سہولت' اور بالآخر جنوری ۱۹۹۵ء میں امریکہ کے ڈیفنس سیکرٹری سے باقاعدہ معاہدے کے تحت بھارت اور امریکہ کے درمیان مشترک جنگی مشقوں کا آغاز ہوا۔

اس زمانے میں ایک اور اہم عنصر امریکہ میں بھارتی تاجروں' صنعت کاروں اور خصوصیت سے انفارمیشن ٹکنالوجی کے اداروں کا کردار ہے۔ امریکہ میں بھارتی نژاد لوگوں کی تعداد میں گذشتہ بیس سال میں چار لاکھ کا اضافہ ہوا ہے جو ۱۹۸۰ء کی تعداد پر ۶۶ فی صد اضافہ ہے۔ انڈین سوفٹ ویئر نے امریکی مارکیٹ میں اپنا مقام بنایا اور صرف یہ تجارت ۱۹۹۱ء میں ۴۵ ملین سے بڑھ کر ۱۹۹۹ء میں ۵ بلین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ اس وقت امریکہ کی سیلی کون ویلی میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار بھارتی سوفٹ ویئر انجینئر کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے لیے بھارت کی کل برآمدات گذشتہ سال ۱۰ بلین ڈالر سے متجاوز ہو گئی ہیں جو بھارت کی کل برآمدات کا تقریباً ۲۲ فی صد ہے۔ اس طرح بھارت کی کل درآمدات کا تقریباً ۹ فی صد امریکہ سے آ رہا ہے۔ امریکہ سے بھارت کا توازن تجارت بھارت کے حق میں ہے (تقریباً ۶ بلین ڈالر سالانہ فاضل) اس لیے امریکہ کی مصنوعات کے لیے بھارت کی منڈیوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بھارت میں امریکی سرمایہ کاری میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت بھارت میں کی جانے والی بیرونی سرمایہ کاری میں امریکہ کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی ہے اور تقریباً ساڑھے چار سو امریکی کارپوریشنیں بھارت میں مصروف سرمایہ کاری ہیں۔ پاکستان سے تقابلی صورت حال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بھارت کی امریکہ کو سالانہ برآمدات (۱۰ بلین ڈالر) پاکستان کی کل برآمدات (ساڑھے آٹھ بلین ڈالر) سے زیادہ ہیں اور بھارت میں کی جانے والی صرف امریکی سرمایہ کاری (۴۵۶ بلین روپے بھارتی) پاکستان کے کل سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔

بھارت نے صرف وزارت خارجہ اور واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے سفارت خانوں پر تکیہ نہیں کیا بلکہ بھارت نواز تنظیموں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ سوا سو سے زیادہ امریکی ارکان کانگرس بھارتی لابی کا حصہ ہیں اور امریکہ میں بھارت نژاد ووٹر اپنے پیسے اور سیاسی اثر و رسوخ کو بڑے موثر انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا کردار اتنا اہم ہے کہ ایک مشہور بھارتی ماہر معاشیات پروفیسر جگدیش بھگوتی جو کولمبیا یونی ورسٹی میں پروفیسر ہے' کہتا ہے:

لیکن ہمارا رسوخ جس حقیقت کی بنیاد پر ہے وہ یہ ہے کہ بھارتی کمیونٹی میرے کہنے کے مطابق امریکہ کے "اگلے یہودی" (next jews) ہیں۔ بہت زیادہ کامیاب، علمی طور پر بلند، معاشی طور پر نمایاں، ان افراد کو وہ تمام networking فوائد حاصل ہیں جو میرٹ پر مبنی انفارمیشن کا رجحان رکھنے والا معاشرہ جیساکہ امریکہ ہے، دے سکتا ہے۔ ہمارا اثرورسوخ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمارے نمایاں دانش ور، آرٹسٹ، سائنس دان، پالیسی ماہرین اور تحقیق کار بارسوخ امریکیوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ میڈیا میں ہمارے مضامین بھی اس رسوخ کی وجہ ہیں۔ ایک ایسے سیاسی نظام میں جو نقد عطیات پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہو، ہمارا سیاسی اثرورسوخ اس لیے بھی برابر بڑھ رہا ہے کہ ہمارے تاجر خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی میں ان نئے ارب پتیوں میں ہیں جن کو جناب کلنٹن، گور، اور بش محض لالچ کی وجہ سے نہایت احترام سے دیکھتے ہیں (The Next Jews، انڈیا ٹوڈے، اپریل ۲۰۰۰ء)۔

بھارت نے اپنا ہوم ورک بڑی ہوشیاری، مہارت اور چابک دستی سے کیا ہے۔ جسونت سنگھ اور ٹالبوٹ کی دس ملاقاتوں نے امریکہ کے پالیسی سازوں کی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ جسونت سنگھ کی کتاب Defending India جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ہے، اس میں غیرجانب دار تحریک پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس پالیسی کے ۵۰ سالوں کو گم شدہ سال (lost year) قرار دیا گیا ہے اور امریکہ سے دوستی ہی نہیں معاہداتی اور اداراتی تعلق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ دستاویز بصیرت (document on vision) کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے بھارت اور امریکہ ویسے ہی رشتہ تحالف میں جڑ گئے ہیں جیسا بھارت نے مشرقی پاکستان پر یورش سے پہلے روس سے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔

کلنٹن کے دورے سے پہلے خارجہ سیکرٹری میڈلین البرائٹ نے ایک بڑا اہم بیان دیا جس میں کہا کہ ہم بھارت سے ماضی کے پچاس سالوں میں بے توجہی کے لیے معذرت کرتے ہیں اور کارل انڈرفرتھ نے صاف لفظوں میں یہ تک کہہ دیا کہ:

> بھارت سے ہمارے مجموعی تعلقات کسی دوسرے ملک سے ہمارے تعلقات کے یرغمال نہیں ہوں گے۔

امریکہ کے چوٹی کے اکیس دانش وروں نے ایک ٹاسک فورس کی طرف سے، جس کی سربراہی مشہور بروکنگز انسٹی ٹیوشن کے نائب صدر اس کے فارن پالیسی اسٹڈیز کے ڈائرکٹر رچرڈ ہاس (Richard N. Haass) نے کی، ایک رپورٹ تیار کی جس میں کلنٹن کو مشورہ دیا گیا کہ سرد جنگ کے بعد دنیا میں بھارت کے کردار کو مرکزی اہمیت دی جائے اور پاک بھارت تنازع اور نیوکلیر معاملات کو اس نئے تعلق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر کو پس پشت ڈالا جائے اور دہشت گردی اور اسلامی تشدد پسندی کے

خطرات کو اہمیت دی جائے۔ اس ٹاسک فورس نے یہ تجویز بھی دی تھی کہ پاکستانی عوام سے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے براہ راست خطاب کیا جائے۔

صدر کلنٹن کے وفد میں ایک بڑی تعداد امریکی تاجروں‘ صنعت کاروں‘ سرمایہ کاروں اور بھارت نژاد امریکی پروفیشنل افراد کی تھی۔ اس ساری کوشش کا ہدف بھارت اور امریکہ کو ایک نئے تحالف میں باندھنا اور مستقبل کے تعاون اور فیصلہ سازی کے لیے تعاون اور مکالمے کا ایک نظام بنانا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاکستان اور ان ایشوز کو پس پشت ڈالا جائے جو پاکستان کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ جس کے بارے میں صدر کلنٹن نے اپنے پہلے جنرل اسمبلی کے خطاب میں تشویش کا اظہار کیا تھا‘ ۴ جولائی کے اعلانیہ میں "ذاتی دل چسپی" کا وعدہ کیا تھا اور ایک روایت ہے کہ اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اپنی صدارت کے دور کے ختم ہونے سے پہلے کشمیر کے مسئلے کا حل تلاش کر لوں گا‘ اس دورے میں اور اس کے بعد ایک ضمنی اور صرف دو طرفہ معاملہ رہ گیا ہے۔ اصل مرکزی مسئلہ دہشت پسندی بن گیا اور وہ بھی پاکستان کی دراندازیوں کی پیداوار کی حیثیت سے۔ چشم زدن میں صدر کلنٹن اور ان کی ٹیم کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو بھی بھول گئے جن کا ذکر خود ان کی تقریروں‘ خطوط اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر میں جنگ بندی کے وقت بھارت کی فوج کی تعداد ۱۲ ہزار تھی جسے مزید کم کرنے کی بات کی گئی تھی۔ آج وہ ۷ لاکھ سے زیادہ ہے جو بھارت کی کل بری فوج کے نصف کے برابر ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں ۷۰ ہزار کشمیری جوان‘ بوڑھے اور بچے شہید کیے جا چکے ہیں لیکن اس ریاستی دہشت گردی کی کوئی خلش بھی اس دوسرے دور کے بیانات میں نظر نہیں آتی۔

دستاویز بصیرت سے لے کر صدر کلنٹن اور ان کے رفقا کی تقاریر کا تجزیہ کیجیے‘ صاف نظر آتا ہے کہ ڈپلومیسی کی زبان میں وہ اسی کے لگ بھگ بات کہہ رہے ہیں جو بھارت کہہ رہا ہے اور ان سے کہلوانا چاہتا ہے۔ بھارت کی جمہوریت کے قصیدے گائے جا رہے ہیں اور بھارت میں اقلیتوں پر جو ظلم و ستم جاری ہے اس کا کوئی احساس موجود نہیں۔ بھارت میں اس وقت سترہ آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن کلنٹن صاحب کو وہاں نسلی‘ لسانی اور مذہبی رواداری اور ہم آہنگی ہی نظر آتی ہے۔ اور دبے لفظوں میں اور بڑی چابک دستی کے ساتھ خود نیوکلیر پالیسی میں بھی تبدیلی کے بیج رکھوائے گئے ہیں۔ بھارت نیوکلیر اسلحہ سے دنیا کو پاک کرنے کے موقف سے ہٹ کر صرف "عدم پھیلاؤ" کی طرف آ گیا ہے جبکہ امریکہ نے بھارت کے سیکورٹی خدشات کو بالواسطہ تسلیم کر لیا ہے اور اسے علاقے ہی میں نہیں عالمی سطح پر قیادت کی اشیرباد دے دی ہے۔ دستاویز بصیرت میں یہ "بصیرت افروز" اعلان موجود ہے کہ:

آیندہ صدی میں بھارت اور امریکہ علاقائی اور بین الاقوامی سلامتی یقینی بنانے کے لیے باہم ذمہ

داری اور مشترک مفاد کی خاطر امن کے لیے ساتھی ہوں گے (partners in peace)۔ ہم ایشیا اور اس سے ماورا اسٹرٹیجک استحکام کے لیے مل جل کر کام کریں گے اور باقاعدہ مشاورت جاری رکھیں گے۔ ہم علاقائی امن کو درپیش چیلنج اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترک کوششوں میں اضافہ کریں گے۔

میڈم البرائٹ نے دورے کے بعد اپنے ایک مضمون میں جو امریکی اخبارات میں ۴ اپریل کو شائع ہوا ہے' فرمایا ہے:

بھارت میں جمہوری ادارے زندگی سے بھرپور ہیں' بنگلہ دیش میں نشوونما پا رہے ہیں اور پاکستان میں خطرے سے دوچار ہیں--- صدر کلنٹن کے بھارت کے دورے کا بنیادی مقصد بھارت کے ساتھ جوہری دھماکوں سے پہلے کی صورت حال کی طرف پلٹنا نہیں بلکہ بہتر اور کارآمد تعلقات کی راہ ہموار کرنا تھا۔

اکانومسٹ نے اس دورے کے نتیجے کے طور پر بھارت اور امریکہ میں ہم آہنگی اور پاکستان کے لیے اس کے مضمرات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

صدر کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے چھ روزہ دورے کے دوران جو بیشتر بھارت کا تھا امریکہ نے علاقے کے سب سے بڑے تنازعے کے بارے میں بھارت کے نقطہ نظر کا اتنا ساتھ دیا جتنا اس سے پہلے کبھی نہ دیا تھا۔ جناب کلنٹن نے صاف صاف کہا کہ بھارت سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کشمیر میں تشدد کی کارروائیاں ختم ہونے سے پہلے پاکستان سے مذاکرات کرے۔ انھوں نے قریب قریب اس بات کو تسلیم کیا کہ چونکہ بھارت اپنے حصے کے کشمیر سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا' اس لیے لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد ہو جانا چاہیے۔ یہ ایسا حل ہے جو بیشتر بھارتی لیکن ابھی تک بہت کم پاکستانی تسلیم کریں گے۔ کچھ پنڈتوں کا دعویٰ ہے کہ امریکہ کی پالیسی میں یہ تبدیلی بھارت کو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گذشتہ بہار میں پاکستانی مداخلت کا انتقام لینے پر اکسائے گی (اکانومسٹ' یکم اپریل ۲۰۰۰ء)۔

بلاشبہ بھارت میں اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ ایشین ایج نے لکھا ہے:

وہ سب کہتے ہیں کہ اس کے دورے نے امریکہ کی دوستی کا توازن پاکستان سے ہٹا کر بھارت کی طرف جھکا دیا ہے۔ (۶ اپریل ۲۰۰۰ء)۔

اگر پاکستان کی قیادت اور قوم ان جوہری تبدیلیوں کو نظرانداز کرتی ہے اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی اور موثر حکمت عملی تیار نہیں کرتی تو یہ زندگی اور ترقی کا نہیں' قومی خودکشی کا راستہ ہو گا۔ صدر کلنٹن نے امریکہ کی ترجیحات' دل چسپیوں' مفادات اور منصوبوں سے مطلع کرنے میں کوئی کسر نہیں

چھوڑی ہے۔ جس انداز میں وہ پاکستان کی سرزمین پر نازل ہوئے وہ کسی جاسوسی ناول کا منظر پیش کرتا ہے۔ تقریر اور گفت و شنید کے لیے جو زبان، طریقہ اور انداز اختیار کیا اس سے کوئی پردہ نہیں رہا۔ تصویر کشی کے لیے بھی احکام تھے کہ صدر اور چیف ایگزیکٹو کے مصافحہ اور ملاقات کی کوئی شبیہ بھی دنیا کے سامنے نہ آنے پائے۔ جمہوریت کے علم بردار جس طرح جمہور سے دور رہے اور صرف سرزنش اور دھمکیوں کو تکیہ کلام بنایا اس پر تو بجاطور پر ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر بھی یہ سوال زیر بحث آ رہا ہے کہ کیا فی الحقیقت اس منظر کی خاطر دورے کا اہتمام کرایا گیا تھا؟ (ملاحظہ ہو ڈان میں ایم ضیاء الدین کا کالم 'The Clinton Visit' مسعود حیدر کا نیویارک سے مضمون 'The Fall out of Clinton Visit' (۲۱ مارچ)، اور شاہین صہبائی کا واشنگٹن سے مضمون Who Pushed me in the Pool? (۳۰ مارچ)۔ غالب پر بھی شاید کوئی ایسی ہی قیامت ٹوٹی ہو گی جو وہ پکار اٹھا ؎

رات کے وقت مئے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

جو سوال اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ ان حالات میں پاکستان کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور وہ کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرے۔ دکھ، افسوس، ندامت، غصہ--- سب بجا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی حالات کا مداوا نہیں کر سکتی۔ ہمارا ردعمل جذباتی اور وقتی حالات کے دباؤ میں نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طبقہ لچک کی باتیں کر رہا ہے اور حقیقت پسندی کے نام پر امریکہ کے نشان زدہ راستے پر کچھ تحفظات اور ظاہری لیپاپوتی کے ساتھ چلنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اس کے لیے حالات کی نامساعدت، معیشت کی زبوں حالی اور عالمی فضا کی دہائی دے رہا ہے۔ ترکی اور ملائیشیا جیسے دوست ممالک کی سرد مہری سے بھی خوف دلایا جا رہا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی نگاہوں کی بھی بات کی جا رہی ہے۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں، جہاد کشمیر میں نرمی، دینی مدارس پر گرفت اور افغانستان سے کشیدگی کے مشورے بھی دیے جا رہے ہیں۔ ٹریک ٹو ڈپلومیسی کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے اور امریکہ کی carrot and stick پالیسی سے خوف اور طمع دونوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ آوازیں اور سرگوشیاں ایک محدود طبقے کی طرف سے ہو رہی ہیں جب کہ قوم کی اکثریت دکھ اور صدمے کے ابتدائی احساس کے بعد بالکل ایک نئے اقدام (initiative) کی متمنی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ قوم کسی امریکہ مخالف جذباتیت (anti America emotionalism) کا شکار ہوئے بغیر پورے عزم اور احترام سے امریکہ کو یہ پیغام دے دے کہ دوستی اور تعاون کا راستہ کھلا ہوا ہے لیکن محکومی اور تابعداری کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ کو حق ہے کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر جو

روش چاہے اختیار کرے لیکن ایک نسبتاً چھوٹے ملک ہونے کے باوجود پاکستان اور اس کے عوام بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی آزادی، سلامتی اور قومی مفادات کی روشنی میں اپنا موقف طے کریں۔

آج پاکستانی قوم جوہری اعتبار سے کچھ ویسے ہی حالات سے دوچار ہے جو ملت اسلامیہ پاک و ہند کو ساٹھ سال پہلے برطانوی دور میں درپیش تھے۔ برطانوی حکومت، انڈین نیشنل کانگرس اور ہندو اکثریت جمہوریت اور عالمی رائے کے نام پر مسلمانوں کے نظریاتی اور سیاسی تشخص کو نظرانداز کر کے انھیں ایک ایسے سیاسی نظام کے شکنجے میں کسنا چاہتی تھی جس میں ان کے لیے دائمی محکومی اور محرومی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمان کمزور تھے، غیر منظم تھے، معاشی اعتبار سے پیچھے تھے اور کانگرس نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ ہندستان میں دو ہی قوتیں ہیں: انگریز اور کانگرس--- ان دونوں کو مستقبل کے فیصلے کا حق ہے۔ قائداعظم اور مسلمانان پاک و ہند نے اس اعلان کو چیلنج کیا اور کہا کہ ایک تیسری قوت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان، جن کا اپنا قومی تشخص ہے--- اور ان کے فیصلے میں شریک ہوئے بغیر اور ان کی رضامندی کے بغیر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں بن سکتا۔ انگریز اور ہندو دونوں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی آواز بے وقت کی راگنی ہے۔ مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تصورات میں مذہب کی بنیاد پر قومیت ایک عجوبہ ہے۔ نیشنلزم اور جمہوریت ہی وقت کے غالب نظریات ہیں اور مسلمان سیاسی طور پر کمزور اور معاشی اعتبار سے غیر موثر ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے عزم اور قربانی، قائداعظم کی بالغ نظر قیادت اور نظریہ پاکستان کی دل کشی اور تسخیری قوت نے سات سال میں حالات کا نقشہ بدل دیا اور جو بظاہر ناممکن تھا وہ ایک زندہ حقیقت بن گیا۔

آج بھی ہم ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں انگریز کی اس تہذیبی ذریت نے جو آزادی کے بعد اقتدار پر قابض رہی ہے، تحریک پاکستان کی کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ قائداعظم کے پاکستان کو دولخت کیا اور جو قوم انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے آزاد ہوئی تھی، اسے بڑی چابک دستی سے امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ آج صدر کلنٹن ہمیں پھر بھارت کی بالادستی کے تحت چین کی زندگی اور معاشی ترقی کے سراب دکھانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اور "کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی" --- اس قوم کے جوہر آزمایش ہی میں کھلتے ہیں اور آج ہم ایک ایسی ہی آزمایش سے دوچار ہیں۔

زمانے کے ساتھ چلنے، اور مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر پلٹ جانے کا مشورہ دینے والے دراصل ہمیں غلامی اور محکومی کی طرف لے جا رہے ہیں اور ہمیں حسن ظن ہے کہ غالباً غیر شعوری طور پر فرار کی اس راہ میں زندگی کا پرتو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عزت اور ترقی کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ اپنی

اصل منزل، اپنے مقصد وجود، اپنی آزادی اور نظریاتی تشخص کے بارے میں کسی سمجھوتے اور نام نہاد لچک کے جال سے بچنا، زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کر کے محنت، جدوجہد اور قربانی کے ذریعے اپنے مطلوب کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جانا ہے: اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

امت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن نے کی ہے اور اس کا پیغام یہی ہے کہ

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھ ہیں اور آخرت میں بھی" (حٰم السجدہ ۴۱:۳۰-۳۱)۔

مشکل وقت میں صبر اور مقابلہ کا حکم دیا گیا:

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کے لیے کربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے (آل عمرٰن ۳:۲۰۰)۔

بلاشبہ ہمیں ہر معاملہ میں اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ ہم حق پر ہیں لیکن حق کے باب میں کمزوری اور سمجھوتے کا راستہ اختیار کرنا، یہ اہل ایمان کی روش نہیں۔ جس کی بہترین مثال خود اسوہ نبویؐ میں ملتی ہے کہ جب قریش کے دباؤ میں خود ان کے عم محترم نے سمجھوتے اور لچک کی بات کی تو آپؐ نے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ لوگ میرے سیدھے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں حق کی دعوت پہنچانے سے باز نہیں آؤں گا حتیٰ کہ یہ دعوت کامیاب ہو جائے یا میں اس میں کام آجاؤں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

اقبال نے بھی اسی اسوہ نبویؐ کی روشنی میں زمانے کے ساتھ چلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی تلقین کی تھی۔

حدیث بے خبران است کہ بازمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

ضرب کلیم کے سارے پیغام کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

خون دل وجگر سے ہے سرمایہ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ!

اور یہی وہ عزم اور رہنمائی تھی جو قائداعظم نے اس قوم کو دی اور اسے کش مکش اور پیکار کے ذریعے آزادی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا:

"آبرو مندانہ تصفیہ صرف برابری رکھنے والے فریقین کے مابین ہو سکتا ہے۔ جب تک دونوں فریق ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے سے خوف زدہ ہونا نہیں سیکھتے' اس وقت تک ان کے درمیان کسی تصفیے کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہوتی۔

کمزور جماعت کی جانب سے امن کی پیش کش کا ہمیشہ مطلب اپنی کمزوری کا اعتراف اور جارحیت کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ (اندریں حالات) حب الوطنی' انصاف' ایمان داری اور خیرسگالی کی اپیلیں رائیگاں ہوں گی (تقریر' ۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء' Speeches and Writings' جلد ۱' ص ۳۲)۔

یہ وہی حکمت عملی ہے جسے قرآن نے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّاللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال ۸: ۶۰) اور تم لوگ' جہاں تک تمھارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے "ن کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے ،مدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت خدا پر بھروسہ' اپنے مقاصد اور اہداف کی حقانیت پر یقین' اپنے موقف پر استقامت اور نفس پرستی اور ذاتی مصالح سے بالا ہو کر اس قوم کی آزادی' سلامتی' عزت اور ترقی کے لیے ڈٹ جانے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور جدوجہد ہے ؎

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اس حکمت عملی کی صحت' صداقت اور افادیت کے بارے میں تو دو رائے ممکن نہیں' البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں پورا کیے بغیر یہ موثر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے دوسروں کی طرف نگاہیں لگانے اور دست سوال دراز کرنے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسہ' اپنے اللہ پر بھروسہ اور اپنی قوم پر بھروسہ ضروری ہے۔ اس کے لیے قوم پر اعتماد' اس کو اصل حالات سے آگاہ کر کے جدوجہد پر آمادہ کرنا اور قیادت کی وہ مثال پیش کرنا ضروری ہے جس کا نمونہ ہمارے آقا اور قائد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا کہ آزمایش کی گھڑی میں اگر عام مسلمانوں کے پیٹ پر ایک پتھر ہوتا تو حضورؐ کے

پیٹ پر دو پتھر تھے!

اندرونی یک جہتی' اور باہمی آویزشوں اور وقتی اور گروہی مصالح سے بالاتر ہو کر پوری قوم کو خود انحصاری کے حصول اور ایسی معاشی اور عسکری قوت کی تشکیل و تعمیر کے لیے سرگرم کرنا ہے جو دشمن پر ہماری ہیبت طاری کر سکے۔ ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور ترقی اس کا ایک پہلو ہے لیکن اس کے ساتھ معاشرتی 'ملی یک جہتی' فکری قیادت' تعلیم و تحقیق کے میدان میں اپنا لوہا منوانا بھی ضروری ہے۔ قوم میں حقیقی اسلامی جہاد کی روح اور اجتماعی زندگی میں انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم اس کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ آج نفرتوں کی جس آگ میں ہم جھلس رہے ہیں اور غربت اور معاشی فساد کے جس جہنم میں آبادی کا بڑا حصہ مبتلا ہے' اس سے نجات ہی ہمیں آزادی اور قومی سلامتی کی حفاظت کے لائق بنا سکتی ہے۔ جمہوری اداروں کا احیا اور قوم کی معتمد علیہ قیادت کا زمام کار کو سنبھالنا اس عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

آج بھی اس عزم' اسی بالغ نظری اور اسی بے لوث جدوجہد کی ضرورت ہے جو ملت اسلامیہ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں ساٹھ سال پہلے کی تھی۔ ان حالات میں فطری طور پر قوم کی نظریں تحریک اسلامی اور ان تمام محب وطن افراد اور قوتوں کی طرف اٹھتی ہیں جن کا دامن ماضی میں کیے جانے والے استحصال' بدعنوانیوں اور بے وفائیوں سے پاک ہے۔ قوم میں آج بھی جان ہے اور ایسے عناصر کی کمی نہیں جو صحیح قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔ آزمائے ہوئے انسانوں اور کھوٹے سکوں سے نجات اور نئی' پر عزم' ایمان دار اور باصلاحیت قیادت کو بروئے کار لانا وقت کی اہم ضرورت ہے جو مجوزہ حکمت عملی کی کامیابی کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ فوجی قیادت اور اس کی سول ٹیم کی اب تک کی کارکردگی سخت غیر تسلی بخش ہے لیکن صدر کلنٹن کے حالیہ دورے اور امریکہ کی سیاست کے نئے رخ نے ایک تاریخی موقع دیا ہے جس سے کسی تاخیر کے بغیر فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے قوم میں اتفاق و اتحاد' تمام اہم عناصر کا ایک مقصد کے لیے تحرک' اور قوم اور فوج میں تعاون' ایک حقیقی طور پر نمایندہ جمہوری نظام کا قیام' اور دفاع اور قومی تعمیرنو دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنے والی قیادت کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کا تقاضا اور درپیش چیلنج کا جواب ہے ~

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا